2019-2020

Project work

N.S. Jabeen taj

C.S.V.C.R. Govt. Degree College

Urdu

B.A. [H.U.P]

Scanned with OKEN Scanner

علامہ اقبال

علامہ اقبال: اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ کے مقام میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباء و اجداد کشمیر کے برہمن تھے۔ ان کا خاندان سترہویں صدی عیسوی میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ سب سے پہلے ان کے دادا شیخ محمد رفیق ترک وطن کر کے سیالکوٹ آئے اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اقبال کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ پھر لاہور گئے۔ جہاں سے 1897ء میں بی۔ اے کامیاب کیا۔ 1899ء میں فلسفے سے ایم۔ اے کیا۔ اسی سال اورینٹ کالج لاہور میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ 1903ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ 1907ء میں جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور لندن سے بیرسٹر کا امتحان پاس کیا۔ اور لاہور آ کر وکالت شروع کی۔ انگریزی حکومت کی جانب سے انہیں سر کا خطاب بھی ملا۔

اقبال اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ابتداء میں مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ پھر داغ نے انہیں فارغ الاصلاح قرار دیا۔ اقبال نظم اور غزل دونوں کے

شاعر ہیں۔ ابتدا میں ہندو مسلم یکجہتی اور وطن کی محبت میں بڑی موثر نظمیں لکھیں۔ پھر اسلامی فلسفے کو اپنی شاعری کا محور بنایا اور سارے عالم اسلام میں ان کی شہرت شاعر مشرق کی حیثیت سے ہوئی۔ ان کا انتقال 1938ء کو لاہور میں ہوا۔ ان کے اہم شعری مجموعے: بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز ہیں۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال 21 اپریل 1938ء کو وفات ہوئی۔

(بالِ جبریل)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ستاروں سے آگے جہاں
اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں
اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں
اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آشیاں
اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زبان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں
انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

(بالِ جبریل)

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

ترا بحر پر سکوں ہے، یہ سکوں ہے یا فسوں ہے،
نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں، نہ خرابیِ کنارہ!

تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ

ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاکِ پے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسّر مری شوخیِ نظارہ

(بالِ جبریل)

شعر

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا، کیا تو مرا ساقی نہیں ہے

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

علامہ اقبال

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی، یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۔

Scanned with OKEN Scanner

فیض احمد فیض

فیض احمد فیض "جن کا اصلی نام فیض احمد خان تھا۔ ان کا تخلص فیض تھا۔ فیض 13 فروری 1911ء کو سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ فیض کے والد کا نام سلطان محمد خان سیالکوٹ کے مشہور بیرسٹر اور بڑے عالم تھے۔ جو ایک وکیل تھے۔ فیض نے ۱۹۲۷ء میں چرچ (اسکاچ) مشن ہائی اسکول سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ فیض نے 1931ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے عربی میں B.A آنرز کیا۔ فیض احمد فیض نے انگریزی سے M.A کیا۔ فیض احمد فیض کا تقرر بحیثیت لیکچرار امرتسر کے اورینٹل کالج میں 1935ء میں ہوا۔ فیض نے ماہ نامہ، ادب لطیف کی ادارت 1938ء میں سنبھالی۔ فیض نے ایک انگریز خاتون ایلس جارج کو مسلمان بنا کر کلثوم نام رکھا اور 1941ء میں ان سے نکاح کیا۔ فیض 1940ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد ہوئے۔

فیض احمد فیض کا نکاح شیخ عبداللہ نے پڑھایا۔ فیض کا تقرر فوج میں کیپٹن کے عہدے پر 1941ء میں ہوا 1943ء میں میجر اور 1944ء (کرنل) میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فیض نے 1947ء میں فوج سے استعفا دے کر "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کی ادارت سنبھالی۔ فیض کو 9 مارچ 1951ء میں لیاقت علی خان

کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش میں گرفتار کر لیا گیا۔ فیض 1 اپریل 1955ء میں قید سے رہا ہوئے۔ فیض کو بین الاقوامی لینن انعام سے 1962ء میں نوازا گیا تھا۔ فیض نے انگلستان، روس، الجیریا، مصر، لبنان اور ہنگری کا سفر 1962ء میں کیا۔ فیض ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ فیض کا انتقال 20 نومبر 1984ء میں لاہور کے ایک ہسپتال میں ہوا۔

فیض کے سات شعری مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے

۱- پہلا مجموعہ نقشِ فریادی 1941ء میں
۲- مجموعہ دستِ صبا 1952ء میں
۳- مجموعہ زنداں نامہ 1956ء میں
۴- مجموعہ دستِ تہِ سنگ 1956ء میں
۵- مجموعہ سرِ وادیٔ سینا 1971ء میں
۶- مجموعہ شامِ شہرِ یاراں 1978ء میں
۷- سارے سخن ہمارے "یہ فیض کے تمام کلام کا مجموعہ ہے جو لندن سے شائع ہوا۔

نظم: تنہائی

پھر کوئی
آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

چند روز اور مری جان

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں تڑپ لیں رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

فیض احمد فیض

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

زندگی کھلے ہیں نہ اُن سے ملے نہ ملے بنی ہے

عجیب رنگ میں اب کے بہار گزاری ہے

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی "جن کا اصلی نام شبیر حسن خان تھا" جوش ملیح آبادی نے 1898ء میں لکھنؤ کے قریب ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق اودھ کے جاگیردار گھرانے سے تھا۔ جوش کے والد کا نام نواب بشیر احمد بشیر بھی شعر و ادب کے استاد تھے گویا جوش کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ان کے دادا نواب احمد خان بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ جوش کے پردادا فقیر محمد گویا لکھنؤ کے مشہور شاعر شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔

ابتدائی زندگی اعلیٰ طبقوں میں بسر ہوئی۔ انہوں نے زمانے کے دستور کے مطابق عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ خود جوش نے نو سال سے شعر کہنا شروع کیا۔ جوش نے پہلے آگرہ اور علی گڑھ میں پڑھتے رہے مگر والد کے انتقال کی وجہ سے تعلیم ادھوری رہ گئی۔ گھر کا بوجھ بھی سر پر پڑا اس لئے وہ ملازمت کیلئے گھر سے نکلے 1924ء میں وہ نواب عماد الملک کی سفارش پر عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دارالترجمہ میں انگریزی ادب کے مترجم کے بعد "ناظر ادبی" کے عہدے پر ترقی ملی۔

1934ء میں حیدرآباد کی ایک علمی محفل میں انہوں نے ایک اشتعال انگیز نظم سنائی جس کے نتیجہ میں مملکت حیدرآباد سرکار عالی سے ان کا اخراج عمل میں آیا۔ پھر وہ دہلی چلے گئے۔ "کلیم اور نیا ادب" کی ادارت سنبھالی فلمی دنیا سے

بھی وابستہ رہے۔ 1952ء میں جوش پاکستان منتقل ہوگئے وہاں مشیر ادبی، مدیر لغت اور مدیر اعلیٰ رسالہ "اردو نامہ" کی حیثیت سے کام کیا۔ آخر 22 فروری 1982ء کو پاکستان میں جوش کا انتقال ہوا۔

جوش کے چند اہم شعری مجموعوں کے نام

- "آیات و نغمات"
- "سنبل و سلاسل"
- "سیف و سبو"
- "شعلہ و شبنم" وغیرہ ہیں۔

بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا۔ ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

وہ سانولے پن پر میداں کی ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا ابھر کر بادل سے چاند جبیں جھلکانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا

بادل میں چھپا تو کھول دیے، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا تو گردوں، دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
مسکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے، امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا۔
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوش نور و ظلمت ہے، کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انسان کی ترتیبِ فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

نظامِ نو

کھیل ہاں اے نوبہارِ انساں، ان سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں، پابجولاں ہے تو کیا
مسکرانے کے لیے ہے جس کی صبحِ وطن
چندے ظلمتِ شامِ غریباں ہے تو کیا؟
جل چکی ہے بے نوائی کو، نسیمِ بازارِ مصر
آج یوسف مبتلائے چاہِ کنعاں ہے تو کیا؟
اب کھلا ہی چاہتا ہے، پرچمِ بادِ مراد
آج ہستی کا سفینہ، وقفِ طوفاں ہے تو کیا؟
اٹھنے والا ہے، نگارِ صبحِ دوراں کا نقاب
آخرِ شب زحمتِ دردِ فراواں ہے تو کیا؟
ختم ہو جائے گا کل یہ ناروا پست و بلند
آج ناہموار سطحِ بزمِ امکاں ہے تو کیا؟
کھل رہی ہے خندۂ گیتی کی زلفِ خم بہ خم
اس کرشمے پر آج دامِ شبنم گریاں ہے تو کیا؟
آ گئیں دل سے تبسم کی شعاعیں تا بہ لب
اشکِ خوں آلود اگر عنوانِ مژگاں ہے تو کیا؟
کل اسی موجِ نفس پر رقص فرمائے گا لحن
آج آہوں سے اگر یہ تار لرزاں ہے تو کیا؟
مٹھیوں میں بھر لے انساں، بڑھ چکا ہے انقلاب

ابرِ غم زلفِ جہاں پر بال جنہاں ہے تو کیا؟

بلبلِ دانش پر افشاں ہے چہکنے کے لیے
آج مرغِ وہم ذہنوں میں غزل خواں ہے تو کیا؟

کل بہ فیضِ عقل بن جائے گا خالص آدمی
آج ہندو ہے تو کیا گبرو مسلماں ہے تو کیا؟

راہ میں ہے کارواں تشکیک اور تحقیق کا
آج اگر نادانی تسلیم و ایماں ہے تو کیا؟

ختم ہونے کو ہے تبلیغِ روایات و رسوم
آج اگر تفسیرِ حکمت جرم و عصیاں ہے تو کیا؟

منصب ہونے ہی کو ہے میزانِ دیدار و دلیل
ہاں اس وقت اگر بالغیب ایماں ہے تو کیا؟

منزلیں طے کر چکا ہے آفتابِ فکر تو
آج اگر روحِ قدامت ظلمت افشاں ہے تو کیا؟

کل یہی بندہ الوہیت سے ہوگا شادکام ۔

مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین : مخدوم محی الدین کا نام اور تخلص ضلع میدک کے ایک گاؤں اندول میں 1908ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام غوث محی الدین تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مخدوم نے عثمانیہ یونیورسٹی سے 1936ء میں ایم۔ اے کامیاب کیا۔ ملازمت کی ابتدائی کلرکی سے ہوئی۔ پھر سٹی کالج حیدرآباد میں اردو کے لکچرار مقرر ہوئے۔ مخدوم اعلی تعلیم کے دوران کمیونسٹ نظریات سے متاثر ہوئے۔ اور مزدور طبقے مسائل کے حل کرنے کی جانے والی جدوجہد میں شامل ہوگئے۔ مخدوم کا دور ادبی اور سیاسی تحریکوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ ملازمت ترک کرنے کے بعد مزدوروں کے مسائل کے حل کرنے کی کا ارادہ کیا۔ مخدوم کے مزاج میں شعر و شاعری سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ ان کے شعری مجموعے سرخ سویرا اور گل تر ہیں۔ ان دو شعری مجموعوں کا انتخاب بساط رقص کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ مخدوم کا انتقال 1969ء میں ہوا۔

مخدوم جب تک زندہ رہے مزدوروں کے لیڈر کی حیثیت

Scanned with OKEN Scanner

بے پسے شہرت رکھتے تھے اور مرنے کے بعد شاعر کی حیثیت سے
ان کی شہرت ہوئی۔ مخدوم کا کلام جہاں ان کے انقلابی اور ترقی
پسند نظریات کا آئینہ دار ہے وہیں اس پر رومانی عناصر کی چھاپ
بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ مخدوم محی الدین کی نظموں کے ہندی، تلگو
مراٹھی، بنگالی کے علاوہ انگریزی، روسی، جرمن اور چیک زبانوں میں
ترجمہ بھی ہوچکے ہیں۔

مخدوم محی الدین نے 1933ء سے شعر کہنا شروع کیا اور
دیکھتے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ اُن کی شاعری کی ابتدائی عشقیہ اور
رومانی نظموں سے ہوئی

مستقبل

چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے

دھڑکتے دلوں کی صدا آرہی ہے
اندھیرے میں آوازِ پا آرہی ہے
بُلا رہا ہے کوئی ندا آرہی ہے

چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے

نہ سلطانیٔ تیرگی ہے نہ زاری
نہ تختِ سلیمان نہ سرمایہ داری
غریبوں کی جنتیں نہ شاہی سواری

چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے

اُڑاتا ہوا پرچمِ زندگی
سُناتا ہوا عہدِ نو کی کہانی
جَلو میں ظفرمندیاں شادمانی

چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے

چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے

شاعر

کبھی قوس قزح سے رنگت لی کبھی نور چرایا تاروں سے
بجلی سے تڑپ کو مانگ لیا کبھی کیف اڑایا بہاروں سے

پھولوں کی مہک شاخوں کی لچک اور جھنڈوں سے ٹھنڈا سایہ
جنگل کی کنواری کلیوں سے دے ڈالا اپنا سایہ

بدمست جوانی سے چھینی یہ بے فکری کا الہڑ پن
پھر حسن جنوں پرور نے دی آشفتہ سری اور دل کی دھڑکن

بکھری ہوئی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے اک اپنا گیت بناتا ہوں

فردوس خیالی میں بیٹھا اک بت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو پتھر کے دل میں بھرتا ہوں -

ساگر کے کنارے

مندر میں پجاری لگے ناقوس بجانے
وہ آن کے بیٹھی پیار سے وہ گیت ان کے بہانے

تاریکیٔ شب اور وہ کلی رخصت ہوا عصیاں
تقدس سے پجاری ہوئے رحمت ترانے

وہ چھاؤں میں تاروں کی وہ کھیتوں کے کنارے
دہقان بھی بھیروں کی لگا تان اڑانے

کوئل نے کسی کنج سے کو کو کی صدا دی
مرغان چمن گانے لگے صبح کے گانے

لی انگڑائیاں لیتا ہوا طوفان جوانی
ملتا ہوا آنکھیں اٹھا فتنوں کو جگانے

جو لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں
گگری لئے سر پر چلیں پانی کی بہانے

انگڑی حسن کے اشغال نکلے
ہر جیتی غیبت کے سمرت کے خزانے

Scanned with OKEN Scanner

مزدوروں کا پیغام

نونہالان چمن اہل ہنر جاتے ہیں
جوش زن قلب میں اک شوق سفر جاتے ہیں
صورت خاک اڑے مثل شرر جاتے ہیں
یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کدھر جاتے ہیں

کوچ کا قافلہ کو حکم خانہ بدوش
کل سے سو جائیں گی بستیوں کی آلائش

ہم کو آخر اسے شکایت ہے نہ قسمت سے گلہ
ہاتف غیب سے پرواز ہیں دوش ہوا
عشق کی شان ہے سہتی ہے طبیعت کو بلا
ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

دل سے نکلا ہے یہ پیغام جگر داروں کا
عزم سرشاری خلاق ہے بے چاروں کا

جوش و اخلاص سے کی روش ہم نے
منظم بیمار کیا در ہر بر خم ہم نے
کر دیا قوم کا اک خواب جنم ہم نے
کوہ غم کوٹ کے پر پر کیا ہم نے

ہم نے نقش ہوس خام انہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے لیکن نام نہیں چھوڑا ہے

Scanned with OKEN Scanner